معیار: علمی وتحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد:۲، شمارہ:۲ جولائی-دسمبر ۲۰۱۰ء

تبصراتی مقالہ

اسلام اور مغرب: ماضی، حال اور مستقبل

۹/۱۱ کے بعد مغرب میں مطالعۂ اسلام کی ایک نئی جہت

Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World

By: Carl W. Ernst, 2006 (2003), Dehli: Yoda Press, Pages 344

نجیبہ عارف*

امریکہ میں لفظ 'اسلام' اور اس کے تلازمات کے بارے میں جاننا چاہیں تو کتابوں کی کسی دکان میں داخل ہو جائیں۔ خون خشک کر دینے والے عنوانات اور سرورق فوراً آپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیں گے۔ یہ سنسنی خیز، صحافیانہ ادب مسلمانوں کی امریکہ دشمنی اور اس کے خلاف دہشت گردی کے لرزا دینے والے منصوبوں کو طشت از بام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ الماریوں میں ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں نہایت سنجیدہ اور محققانہ انداز میں مسلم تہذیب کی ناکامی اور اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کی پیش گوئیوں کی تصدیق کی گئی ہے۔ وہیں کسی گوشے میں، اسلام کے فلسفۂ مذہب اور تاریخ سے متعلق، بیزار کن اور پیچیدہ نثر میں نصابی مباحث پر مبنی کچھ جائزے اور مطالعات بھی مل جاتے ہیں۔ شاید چند ایک مسلمان مصنفین کی اسلام کے خلاف الزام تراشیوں کے جواب میں دفاعی نقطۂ نظر سے لکھی گئی، معذرت خواہانہ انداز کی تحریریں بھی مل جائیں اور آخر میں دو تین تراجمِ قرآن ۔۔۔ ایک اجنبی زبان کا پراسرار اور ناقابل فہم متن۔ تو پھر اسلام سے شناسائی کیسے ہو؟!

یہ وہ سوال ہے جو کارل ارنسٹ (Carl Ernst) نے اپنی کتاب ''برنقشِ کفِ پائے محمدؐ'' (*Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World*) کے مقدمے میں، اپنی تصنیف کا جواز پیش کرتے ہوئے اٹھایا ہے۔ کارل ارنسٹ کا نام امریکہ میں مطالعات اسلامی کے پروفیسر کی حیثیت سے نیا نہیں۔ وہ کئی برس سے نارتھ کیرولینا یونی ورسٹی میں مطالعۂ اسلام کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور کیرولینا مرکز برائے مطالعۂ مشرقِ وسطیٰ اور تہذیب اسلامی کے ڈائریکٹر ہیں۔ انھیں اہم السنۂ شرق یعنی عربی، فارسی اور اردو سے خوب واقفیت حاصل ہے اور اپنے تحقیقی منصوبوں کے سلسلے میں وہ ایران، ترکی، پاکستان، ہندوستان، اور افریقی ممالک میں کئی بار سفر کر چکے ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں *Sufi Martyrs of Love: Chishti Sufism in South Asia and Beyond* (۲۰۰۲ء)، *Teachings of Sufism* (۱۹۹۹ء)، *Ruzbihan Baqli. The Unveiling of Secrets: Diary of a*

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

Ruzbihan Baqli: Mystical Experience and the Rhetoric of Sainthood in Persian،(۱۹۹۷ء) *Sufi Master.* *Eternal Garden: Mysticism, History, and Politics at a South Asian Sufi Center.* ،(۱۹۹۶ء) *Sufism* (۱۹۹۲ء۔ یہ کتاب غلام علی آزاد بلگرامی کی معروف فارسی تصنیف ''روضۃ الاصفیا کا ترجمہ ہے جو خلد آباد کے علما و مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے) شامل ہیں۔ حال ہی میں ان کی تازہ کتاب *Rethinking Islamic Studies:From Orientalism to Cosmopolitanism* (۲۰۱۰ء) شائع ہوئی ہے جسے انھوں نے رچرڈ مارٹن کے ساتھ مل کر مرتب کیا ہے۔ مگر ارنسٹ کی اہم ترین کتاب *Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World* ہے جو ۲۰۰۳ء میں پہلی بار نارتھ کیرولینا یونی ورسٹی پریس سے شائع ہوئی اور عربی، فارسی، ترکی، جرمن اور کورین زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور برطانیہ سمیت کئی ممالک میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب نے علمی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی اور کئی عالمی ایوارڈ بھی حاصل کیے۔[۲]

کتاب کے مقدمے ہی میں انھوں نے چند ذاتی تجربات کے ذریعے اس پس منظر سے واقف کر دیا ہے جس میں نہ صرف اس کتاب کی ضرورت اور اہمیت اجاگر ہوتی ہے بل کہ ۱۱/۹ کے بعد امریکہ میں تیزی سے ابھرنے اور پھیلنے والے اسلام مخالف جذبات کی شدت اور نوعیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب انھوں نے ۲۰۰۲ء میں تصنیف کی تھی جب ۱۱/۹ کا واقعہ رونما ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا تھا۔ اس تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی متعصّبانہ اور بنیاد پرستانہ تفہیم سے دور رہتے ہوئے اس کی مذہبی روایت اور عصری تاثر کا، ایک مختلف اور ہم دردانہ مگر تجزیاتی اور استدلالی مطالعہ پیش کیا جائے۔ اس بظاہر سہل اور منطقی کوشش کی راہ میں حائل مشکلات کا اندازہ دو واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۲۰۰۲ء کے موسم گرما میں جب وہ اس کتاب کا مکمل مسودہ لے کر اس ناشر کے پاس پہنچے، جس سے اس کی اشاعت کا معاہدہ پہلے سے طے تھا، تو ناشر نے خاصی تاخیر کے بعد انھیں یہ مژدہ سنایا کہ وہ اس کتاب کی اشاعت سے معذور ہے کیوں کہ ادارتی بورڈ کے کچھ ارکان اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں شدید تحفظات رکھتے ہیں۔ یہ تحفظات مسودے کی علمی و تحقیقی نوعیت کے بارے میں نہیں تھے بل کہ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک ایسی کتاب کی اشاعت کے منصوبے میں شریک نہیں ہو سکتے جو 'دہشت گردی' کے جواز میں تحریر کی گئی ہو۔

دوسرا واقعہ نارتھ کیرولینا یونی ورسٹی کے موسم گرما کے تدریسی پروگرام کے دوران پیش آیا جب پروگرام کے انچارج نے خواہش ظاہر کی کہ موسم گرما کے دوران کوئی ایسا کورس پیش کیا جائے جو ۱۱/۹ کے بعد اٹھنے والے سوالات اور مسائل سے متعلق ہو۔ اس مقصد کے لیے کئی موضوعات زیر بحث آئے۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ، دہشت گردی اور اسی نوع کے کئی دوسرے موضوعات کو رد کرنے کے بعد مصنف سے دریافت کیا گیا کہ کیا سال اول کے طالب علموں کو ترجمۂ قرآن پڑھانا مناسب رہے گا؟ مصنف نے فوراً اس تجویز پر صاد کیا اور مائکل سیلز (Michael Sells)[۳] کا ترجمہ *Approaching the Quran:The Early Revelations* تجویز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تدریسی پروگرام ملکی اور بین الاقوامی سطح پر زیر بحث آ گیا اور ورجینیا کے ایک عیسائی گروپ نے مسلم دہشت گردوں کی حمایت کا الزام لگا کر یونی ورسٹی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ ریاست کی مجلس قانون ساز کے اراکین بھی اس تدریسی پروگرام پر غضب ناک ہو گئے اور اگرچہ وفاقی عدالت نے مقدمے کا فیصلہ یونی ورسٹی کے حق میں کر دیا تاہم ان واقعات سے اس تکلیف دہ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ امریکہ میں اسلام کے بارے میں بے لاگ اور منصفانہ بحث کو رواج دینا کس قدر دشوار مگر کتنا ضروری ہے۔ ارنسٹ لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب شکوک و شبہات، غلط اور گمراہ کن معلومات

اور اسلامی عقائد وتعلیمات کے بارے میں آزادانہ غور وفکر کی غیر موجودگی کے باعث پھیلنے والی دھند میں راستہ بنانے کے لیے تحریر کی ہے۔
یہ کتاب دراصل اس خصوصی دلچسپی کا مظہر ہے جو ۹/۱۱ کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں، اسلام اور اس کے عقائد، نظامِ معاشرت اور فکری اساس کے بارے میں مغرب، بالخصوص امریکہ میں پیدا ہوئی ہے۔ شمالی امریکہ کی دیگر جامعات کے علاوہ نارتھ کیرولینا میں تین یونی ورسٹیوں کی ایک مثلث خاص طور پر اس حوالے سے نمایاں ہوئی ہے جہاں اسلام کا سنجیدگی، دلچسپی اور فکری آزادی سے مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ کارل ارنسٹ کا تعلق اس تکون سے ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں انھوں نے واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں[۴] اور اس کتاب کی تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے اس انسان دوست تاثر کو اجاگر کیا جائے جو صوفیا کی تعلیمات کا عطر ہے اور انسانیت کے تحفظ کی خاطر، بین المذاہب ہم آہنگی، برداشت اور تحمل کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ انھیں اپنے اس مقصد کی راہ میں حائل دوطرفہ دشواریوں کا بھی احساس ہے جن کا ایک پہلو تو یورپ اور امریکہ میں اسلامی نظریات ونظامِ حیات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے اور دوسرا خود مسلمانوں کے انتہا پسند عناصر کی سرگرمیوں کا ردِعمل ہے جو اسلام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کا یہ اعتراف کہ اسلام کا غیر جانب دارانہ مطالعہ اس لیے ضروری ہے تاکہ امریکیوں کو معلوم ہو سکے کہ مسلمان بھی انسان ہیں اور انسانیت کے کل کا ایک جزو ہیں[۵]، اصل صورت حال کا چشم کشا اشارہ ہے۔
کتاب کل چھے ابواب پر مشتمل ہے جس میں اسلام کا بطور مذہب اور نظامِ حیات مطالعہ کیا گیا ہے۔ کئی مقامات پر یہ مطالعہ اس قدر جامع اور گہرا نہیں مگر مجموعی طور پر مصنف کا نقطۂ نظر بے تعصبی اور غیر جانب داری پر مبنی ہے۔ تاہم اس کتاب کا پہلا باب جسے، اس مضمون میں موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، کئی حوالوں سے اس لائق ہے کہ اس کے مندرجات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور ان کی روشنی میں مغرب میں پھیلنے والے اسلام کے منفی تاثر کے اسباب ومحرکات پر غور کیا جائے۔ اس باب کا عنوان ہے ''اسلام: مغرب کی نظر میں''۔
ارنسٹ نے مغرب کو امریکہ اور یورپ کا مترادف قرار دیا ہے۔ امریکہ میں پھلنے پھولنے والی تہذیب کا منبع یورپی تہذیب ہی قرار پاتی ہے مگر گزشتہ پانچ سو برس کے دوران خود امریکی روایات بھی پروان چڑھیں۔ مغرب کی جو علاقائی یا جغرافیائی حد بندی ارنسٹ نے اختیار کی ہے اس پر بیشتر مغربی مفکرین متفق ہیں حالاں کہ جغرافیائی اعتبار سے یورپ اور امریکہ میں ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ موسم اور آب وہوا کے لحاظ سے بھی دونوں خطے ایک جیسے نہیں۔ ان اصطلاحات کا استعمال اس وقت شروع ہوا جب مغربی یورپ کی حکومتیں غریب ممالک کو غلام بنانے میں مصروف تھیں اور مغربی یورپ کو مرکز مانتے ہوئے اس کے مشرق کی جانب واقع علاقوں کو ''مشرق'' پکارنے لگی تھیں۔ اب جب کہ امریکہ تمام بین الاقوامی امور میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا ہے اور مغربی یورپ کے علاقے امریکہ کے مغرب نہیں، بل کہ مشرق میں واقع ہیں، امریکہ کے حوالے سے یورپ کو ''مغرب'' شمار کرنا درست نہیں لیکن اس کے باوجود شمالی امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک خود کو مشترکہ طور پر مغرب قرار دیتے ہیں۔[۶] ارنسٹ نے بھی اسی خیال کو بنیاد بنایا ہے لیکن ان کی کتاب کے مضامین یورپ سے زیادہ امریکی قوم کے فکری وتہذیبی رویوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

[۱]

اسلام اور مغرب: عصری تناظر

اسلام اور مغرب دو مختلف نوعیت کی اصطلاحات ہیں۔ مغرب ایک جغرافیائی اصطلاح ہے جو کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ ہے جب کہ اسلام

کا تعلق معتقدات ونظریات سے ہے۔ دونوں کے درمیان ایسی کوئی یکسانیت موجود نہیں جس کی بنا پر دونوں کا تقابل کیا جا سکے۔ لیکن یہ تقابل عہد حاضر کی فکری جستجو کا اہم محور بن چکا ہے۔ برنارڈ لیوس نے اس تقابلی مطالعے کا جواز پیش کرتے ہوئے ''مغرب'' کی لسانی اصطلاح کو قرونِ وسطیٰ میں استعمال ہونے والی اصطلاح ''عیسائی دنیا'' (Christendom) کا متبادل قرار دیا ہے۔[۷] نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں مذہبی تشخص نے ثانوی اور سیکولر نظریات نے اولین اہمیت حاصل کر لی تو یورپ، جو پہلے عیسائی دنیا سمجھا جاتا تھا، خود کو مغرب کہنے لگا۔ گویا مغرب سے وہ ممالک مراد ہیں جہاں یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد سیکولرازم کا دعویٰ کیا جانے لگا۔ دوسری طرف اسلام سے وہ خطے یا ممالک مراد لیے جاتے ہیں جہاں اسلامی نظام رائج ہے۔ یہ بھی ایک پیچیدہ معاملہ ہے اور ارنسٹ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ مذہبی تصورات کی وحدت کے پس پشت تکثیریت کارفرما ہوتی ہے اور انھیں مختلف طرح سے دیکھا، سمجھا اور برتا جاتا ہے لہٰذا پوری اسلامی دنیا کو عصر جدید میں ایک یکساں اکائی قرار دینا معاملے کو غیر ضروری طور پر سادہ کر لینے کے مترادف ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ماضی کو رد کرنے اور حال کو حقیقت کی واحد میزان خیال کرنے کا عمل بھی نظر ثانی کا محتاج ہے۔ جدیدیت کی جس منہ زور لہر نے ماضی کے مقابلے میں، زمانۂ حال کو مغرب کا خیر مطلق قرار دے رکھا ہے، ارنسٹ نے اس پر تنقید کی ہے کیوں کہ حال ایک نہ ایک دن ماضی ہو جاتا ہے اور اگر ماضی فرسودہ اور بے معنی ہے تو حال بھی اس تہمت سے پاک نہیں رہ سکتا۔ مغرب میں مذہب کو محض حال کی روشنی میں پرکھنے کا عمل جاری ہے اور یہی عمل درست نتائج کے استنباط میں حائل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد واحکامات کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ کی لسانی تاریخ اور مختلف عصری تناظرات میں ان کا استعمال بھی قابلِ غور ہے جس کے بغیر مذہب کی روح تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

[۲]

تہذیبی برتری کا دعویٰ اور تاریخی حقائق

ارنسٹ نے اہلِ مغرب، بالخصوص امریکی قوم کی نفسیات اور احساسِ برتری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکی بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں مگر وہ اپنے علاوہ دیگر اقوام کی تہذیب وثقافت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب (یعنی یورپ اور امریکہ) اور باقی دنیا کے درمیان اجنبیت اور لاعلمی کی ایک گہری خلیج حائل ہے۔ افہام وتفہیم کا عمل اگر ہے بھی تو نامکمل اور یک طرفہ۔ یعنی ایجادات، اشیا اور تصورات ونظریات کا بہاؤ مغرب سے دنیاے دگر کی جانب ہے۔ اس عمل کو عہدِ حاضر میں عالم گیریت (گلوبلائزیشن) کا نام دے دیا گیا ہے۔ مغرب کے نوآبادیاتی دور میں چند یورپی زبانوں نے؛ جن میں انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی اور روسی شامل ہیں، دنیا بھر میں اہمیت اختیار کر لی اور ان کا کلچر پوری دنیا میں ممتاز ومعتبر سمجھا جانے لگا۔ یہی زبانیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنیں اور ذرائع ابلاغ پر قابض ہو گئیں۔ دوسری دنیا کے لیے ان زبانوں اور ان سے منسلک تہذیب وثقافت کو اپنانا ناگزیر ہو گیا لیکن امریکی اور یورپی اقوام کے لیے دوسری زبانوں جیسے چینی، اردو، عربی، بنگالی، انڈونیشین زبانوں کو نظر انداز کرنا بالکل فطری معلوم ہونے لگا۔ امریکی اور یورپی ادیب، شاعر اور فن کار دنیا بھر میں معروف ومقبول ہو گئے لیکن ایشیائی، افریقی یا مشرق وسطیٰ کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو یہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ اور مغرب کی جامعات میں لاکھوں کی تعداد میں نوجوان طالب علم تاریخ، سیاسیات اور کلچر سے متعلق نصابی کتابوں کے ذریعے یہی سبق پڑھتے ہیں کہ تہذیب کی اولین تحریک میسوپوٹیمیا اور عراق سے آغاز ہوئی مگر اسے باقاعدہ سمت اور رفتار یونان میں حاصل ہوئی۔ یونان کے زوال کے بعد یہ شمع روم نے روشن رکھی اور پھر دیگر یورپی ممالک، فرانس، جرمنی اور سپین سے ہوتی ہوئی انگلستان تک پہنچی جہاں سے بالآخر تہذیبی سیادت کی یہ سعادت امریکہ کو نصیب ہوئی۔ ایک نظریے کے مطابق امریکہ میں بھی کیلی فورنیا کا علاقہ وہ مقام ہے جسے

مغربی تہذیب کا نقطۂ عروج قرار دیا جاسکتا ہے تاہم نیویارک جیسے علاقوں سے اس آخری نقطۂ نظر سے اختلاف کی صدا بلند ہوتی رہتی ہے۔
اس نقطۂ نظر کے مطابق مغربی تہذیب کے بنیادی ماخذ دو ہیں: اخلاقیات اور مذہبی معتقدات کا سرچشمہ اسرائیلی الہامی مذاہب اور صحائف ہیں اور سائنسی علوم اور جمہوری طرزِ حکومت کا منبع حکمتِ یونان ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر اسلامی تہذیبی سفر کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ ارنسٹ کے خیال میں اسلامی تہذیب بھی انھی دونوں منابع سے کسبِ فیض کی دعویدار ہے۔ اگرچہ ارنسٹ کا یہ خیال ایک طویل بحث کا متقاضی ہے لیکن وہ اس دعوے کا یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ سمیت نبیوں اور رسولوں کی ایک کثیر تعداد کا اثبات موجود ہے اور حکمت یونان کو یورپ سے متعارف کرانے کا سہرا بھی مسلمانوں ہی کے سر ہے۔ لیکن یونانی علوم کے یورپ میں احیا کے بعد مسلم دنیا میں فلسفے اور علوم کا ارتقا تھم نہیں گیا تھا بلکہ ایران اور ہندوستان میں زمانۂ حال تک مسلم فلسفہ کئی اہم تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ بدقسمتی سے ایک مخصوص طبقے کے علاوہ، مغربی علما عام طور پر مسلم فلسفے کے اس ارتقا سے ناواقف رہے ہیں۔ لہٰذا مغرب کا یہ دعویٰ کہ وہ اسرائیلی پیغمبروں کے مذاہب اور حکمت یونان کا تنہا وارث ہے، درست نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد، تہذیب کے دھارے کی ایک لہر روم سے مشرق کی جانب بھی رُخ کر چکی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تہذیب کے تنہا وارث ہونے کا دعویٰ یک طرفہ نہیں تھا، چودھویں صدی کے اواخر میں، شمالی افریقہ کے ایک عرب مؤرخ اور فلسفی ابن خلدون (۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء) نے بھی یہ ''افواہ سنی تھی کہ شمالی فرنگستان کے کچھ وحشی، یعنی یورپی عیسائی، فلسفے وغیرہ میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اسے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا''۔[۸] بلاشبہ ایسی لاعلمی کا کم از کم موجودہ دور میں کوئی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا اور اہلِ مغرب تہذیبی ارتقا میں مسلمانوں کے کردار کو نظر انداز کر کے خود اپنے تشخص کو مشکوک بنا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تہذیبوں کے تصادم جیسے نظریات اس مغالطے کو فروغ دے رہے ہیں کہ یورپ کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی دراصل اس کی تہذیبی برتری کا ثبوت ہے۔ ادھر اسلام کے حلقے سے بھی کچھ لوگ مغرب اور دنیاے اسلام میں ازلی مخاصمت کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی نتیجہ قائم کرنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ عوام الناس سے خطاب کے دوران جو مذہبی زبان استعمال کی جاتی ہے وہ محض معلومات کی ترسیل کے لیے نہیں، بلکہ مذہبی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے وضع کی جاتی ہے۔[۹] یہاں مذہبی زبان سے ارنسٹ کی مراد، صحائف کی زبان نہیں بلکہ مذہبی حلقوں کی جانب سے استعمال ہونے والی زبان ہے جس سے عوام کی پسند، ناپسند اور جوش و جذبے کا رُخ مطلوبہ سمت میں موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مذہبی اصطلاحات اور لسانی اظہارات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے تاریخی تناظر کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ یورپ کا اسلام کے خلاف تعصب نوآبادیاتی نظام کا کوئی قابل قبول جواز پیش کرنے کی کاوش ہوسکتا ہے اور معاصر اسلامی حلقوں میں مغرب مخالف واویلا اسی نوآبادیاتی تسلط کے ردعمل کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔[۱۰] نیز اس بات سے بھی ہشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ دونوں طرف کے سیاسی حلقے اور حکمران اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے مذہب کو ایک آلۂ کار اور ہتھکنڈے کے طور پر بھی استعمال کرتے آئے ہیں۔ مذہبی جذبات کے اس استحصال کی مثالیں تاریخ کے صفحات سے لے کر زمانۂ حال تک موجود ہیں۔

[۳]
مغرب میں اسلام دشمنی: تاریخی تناظر

یہ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ مغرب میں کسی مذہب کا ایسا منفی تاثر قائم نہیں ہوا جیسا اسلام کا۔ گاندھی نے ہندومت کا عدم تشدد کا فلسفہ دنیا میں متعارف کروا کے خاصا مثبت تاثر قائم کر لیا اور دلائی لامہ نے تو دنیا بھر میں بدھ مت کا خوش گوار تعارف کروا دیا۔ یورپ اور امریکہ میں

گزشتہ صدی کے دوران یہودیت کے بارے میں بھی بہت مثبت تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ یہود دشمنی اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز تک عام تھی لیکن ہولوکاسٹ اور اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد اس میں نمایاں کمی آئی ہے۔ عیسائیت یونہی مغربی اکثریت کا مذہب ہے اور اسے کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا۔ اب رہا اسلام تو ذرائع ابلاغ مسلسل اس کا ایک منفی تاثر قائم کرتے آئے ہیں اور یہ تاثر کم وبیش پورے مغرب میں نفوذ کر چکا ہے۔ یہ منفی تاثر کیوں قائم ہوا؟ مسلمانوں کے ماضی اور حال کا رشتہ کس حد تک استوار ہے؟ مسلمانوں کے خلاف یہ مخاصمانہ جذبات جنھیں مغرب میں قبول عام حاصل ہو چکا ہے، کیا جواز رکھتے ہیں؟ یہ وہ سوال ہیں جنھیں اٹھانا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں سامی النسل یہودیوں سے دشمنی کو کوئی معزز شخص جائز نہیں سمجھتا۔ اس بات پر کم وبیش پوری عوام کا اتفاق ہے کہ یہودیوں کے بارے میں تحقیر آمیز کلمات ادا کرنا یا ان کی توہین کرنا، خواہ یہ جسمانی خصائص کی بنا پر ہو یا رویے کی بنا پر، قابلِ نفرت اور بداخلاقی کا مظہر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی عوام کا تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ تک اس بات کا قائل نظر آتا ہے کہ اسلام بذاتہ عورتوں پر ظلم کرنے والا اور تشدد پسند مذہب ہے۔ شماریاتی اعتبار سے بھی اس امر کا تجزیہ دلچسپ نتائج پیش کرتا ہے۔ دنیا میں یہودیوں کی آبادی سترہ ملین ہے جو سکھوں کی آبادی سے کچھ کم ہے۔ ظاہر ہے یہ سمجھنا مضحکہ خیز ہوگا کہ اتنی بڑی آبادی کا ہر فرد ایک جیسی خصوصیات، عادت واطوار کا مالک ہوگا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ مسلمانوں کی آبادی ایک بلین سے بھی کچھ اوپر ہے اور اتنی بڑی آبادی کے ہر فرد کو ایک جیسی خصوصیات کا حامل قرار دے دیا جاتا ہے جو یقیناً بہت بڑی غلطی ہے۔

حقیقت یہ ہے؛ اور جیسا کہ مطالعہ اسلام کے ایک نام ور اسکالر، مارشل ہوجسن (Marshal Hodgson۔۱۹۶۸ء۔۱۹۹۲ء) نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب The Ventures of Islam: Conscience and History in the World Civilaiztion میں کہا ہے، کہ گزشتہ ۲۰۰ سال سے کسی علیحدہ اسلامی دنیا کا وجود نہیں ہے۔ نہ سیاسی طور پر، نہ معاشی طور پر، نہ تہذیبی وثقافتی طور پر اور نہ عسکری اعتبار سے۔ اکثر مسلم ممالک کی تقدیر اس تمام عرصے کے دوران کسی نہ کسی طور پر یورپ اور امریکہ سے وابستہ رہی ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارے، کثیر القومی تجارتی ادارے، ذرائع ابلاغ کے دیو اور انٹرنیٹ کی دنیا نے ایک ایسی دنیا کی تشکیل کی ہے جس میں کسی ایک کلچر کو دوسرے کے اثرات سے پاک رکھنا کم وبیش ناممکن ہے۔ دوسری طرف اگر ۵۰ سے زیادہ مسلمان ممالک کی جانب دیکھا جائے تو ان کا تہذیبی وثقافتی تنوع، لسانی، نسلی اور گروہی اختلافات اور نظریاتی وفرقہ وارانہ اختلافات حیران کن ہیں۔

مغرب اور اسلام یا دوسرے لفظوں میں عیسائی دنیا اور دنیاے اسلام کے درمیان روابط کی تاریخ کھنگالتے ہوئے ارنسٹ نے لکھا ہے کہ یہودیوں کی نسبت عیسائیوں کے مسلمانوں کے بارے میں مخاصمانہ جذبات وتاثرات نے موجودہ نفرت انگیز فضا تیار کرنے میں زیادہ بڑا کردار ادا کیا ہے۔ قرون وسطیٰ میں عیسائیوں کی نسبت یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ قریبی تعلقات قائم رہے ہیں اور حال ہی میں اسرائیلی ریاست کے قیام تک دونوں ایک دوسرے کے رفیق ومعاون رہے ہیں۔ مصنف کا یہ نقطۂ نظر نہ صرف اسلامی مؤرخین کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے جو عیسائیوں کی نسبت یہودیوں کو اسلام کا دشمن قرار دیتے ہیں اور اس کا سرا پہلی اسلامی ریاستِ مدینہ میں یہودیوں کی اسلام دشمنی سے ملاتے ہیں، بل کہ ان کے ہم عصر برنارڈ لیوس بھی مسلمانوں اور عیسائیوں کو ایک دوسرے کا ازلی ہمسایہ اور کئی مشترک اوصاف کا مالک قرار دیا ہے۔[۱۱] مگر ارنسٹ نے قرون وسطیٰ سے لے کر اب تک، عیسائیوں کی مسلم دشمنی کا جو اجمالی جائزہ پیش کیا ہے وہ ان کے اس دعوے کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ عیسائی راہب بحیرہ (جس نے پیغمبر اسلام کو نبوت کی بشارت دی تھی) کی کردار کشی سے لے کر موجودہ زمانے تک عیسائی دنیا میں

اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں منفی پراپیگنڈے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔[۱۲]

۱.۳۔ پیغمبر اسلام کی کردار کشی اور عیسائی پراپیگنڈہ:

اسلام عیسائیت کو ایک الہامی مذہب قرار دیتا ہے اور دنیا بھر کے مسلمان بالاتفاق عیسیٰؑ اور مریمؑ کو لائقِ تعظیم سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف قرونِ وسطیٰ سے لے کر آج تک عیسائیوں نے مسلمانوں کی ان کے پیغمبر سے عقیدت اور والہانہ شیفتگی کو ہمیشہ زخم لگانے کی کوشش کی ہے۔ (حضرت) محمدؐ کی وہ تمام صفات، جو مسلمانوں کے نزدیک محترم، مثالی اور لائقِ تقلید ہیں، عیسائی مصنفین نے انھیں منفی انداز میں، خامیوں کے طور پر پیش کیا۔ یہ روایتی نظریہ کہ (حضرت) محمدؐ "امّی" تھے، مسلمانوں کے لیے اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ان پر نازل ہونے والی وحی خدا کا کلام ہے لیکن عیسائیوں کے نزدیک یہ جعل سازی کا ثبوت تھا۔ (حضرت) محمدؐ کا ابراہیم کے بیٹے اسماعیل کی نسل سے ہونا بھی ان کے نزدیک غلط دعویٰ تھا (عیسائی اس دعوے کو غلط نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسماعیل کو ایک لونڈی حاجرہ کی اولاد ہونے کے باعث کم تر خیال کرتے تھے اور اس بنا پر (حضرت) محمد کے دعویٔ نبوت کو مبنی پر کذب ثابت کرتے تھے)۔ (حضرت) محمدؐ نے مشرکین مکہ کی، معجزات دکھانے کی فرمائش کے جواب میں قرآن کو اپنا معجزہ قرار دیا تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ بات (حضرت) محمدؐ کی روحانی عظمت کی دلیل ہے مگر عیسائیوں نے اسے اس بات کا واضح ثبوت سمجھا کہ (حضرت) محمدؐ خدا کے نبی نہیں تھے۔

حیاتِ (حضرت) محمدؐ پر اہلِ مغرب کی سب سے سخت تنقید آپؐ کی عسکری مہمات اور تعددِ ازدواج سے متعلق رہی ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک عیسیٰ کی طرح تجرد اور عدم تشدد کی زندگی روحانیت کا لازمی جزو ہے۔ (حضرت) محمدؐ کا جنگوں میں شامل ہونا اور تعدد ازدواج ان کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ روحانی عظمت کے اس بلند معیار کو نہیں پہنچتے جسے عیسیٰؑ نے اپنے طرزِ عمل سے قائم کیا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا ایمان ہے کہ (حضرت) محمدؐ ایک کامل انسان کا نمونہ تھے۔ انھوں نے خود اپنے اسوہ حسنہ کے ذریعے اپنے پیروکاروں کو ایک متوازن اور مکمل زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے اور ان کا زندگی کے حقیقی معاملات میں شریک ہونا ان کی پیغمبرانہ شان کو کئی گنا زیادہ کر دیتا ہے۔ وہ عیسیٰؑ کے تجرد اور عدم تشدد کو انسانی نفسیات اور اس کی باطنی حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ دونوں مذاہب کے درمیان نقطۂ نظر کا یہ اختلاف کئی صورتیں اختیار کرتا چلا گیا۔ ایک طرف کلیسائی اکابرین کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ کلیسائی دائرے سے باہر کسی کو پیغمبرانہ عظمت حاصل ہو سکتی ہے اور دوسری طرف مسلمان صدق دل سے کلیسائی عقائد، بالخصوص تثلیث کے عقیدے کو، اصل مسیحی تعلیمات سے روگردانی اور گم راہی خیال کرتے تھے۔

مسلمان محمدؐ کو رحمۃ اللعالمین خیال کرتے ہیں اور عیسیٰ کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ قرار دیتے ہیں۔ عیسائی مصنفین اس رویے کے بالکل برعکس، مسلمانوں کی (حضرت) محمدؐ سے غیر معمولی عقیدت اور شیفتگی کو ٹھیس پہنچانے اور (حضرت) محمدؐ کی سیرت و کردار کو مسخ کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اگرچہ چند ایک مصنفین نے بے تعصبی سے حیاتِ محمدؐ رقم کرنے کی کوشش بھی کی مگر اکثریت کا رجحان منفی تاثر کو ابھارنے کی طرف ہی رہا اور اکثر صورتوں میں اس انتہا تک جا پہنچا کہ بہتان طرازی اور کذب و افترا کی نوبت آن پہنچی۔ مثلاً یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام میں شراب نوشی اور سؤر کو حرام قرار دیا گیا ہے مگر عیسائی مصنفین نے (حضرت) محمدؐ کی وفات سے متعلق ایسی ایسی کہانیاں تراشیں جن میں پیغمبر اسلام کو نشے کی حالت میں جان دیتے ہوئے یا سؤروں کے ہاتھوں ہلاک ہوتے ہوئے پیش کیا گیا۔ فرانسیسی رزمیے Song of Roland[۱۳] میں (حضرت) محمدؐ کو کافروں کے ایک بت کے طور پر پیش کیا گیا جس کی عبادت کی جاتی تھی۔ دانتے (Dante۔۱۲۶۵ء۔۱۳۲۱ء) کی

مشہور عالم تمثیلی نظم، ڈیوائن کامیڈی میں (حضرت) محمدؐ اور آپؐ کے داماد علیؓ کو دوزخ میں دکھایا گیا ہے۔ پروٹسٹنٹ مصلح مارٹن لوتھر (Martin Luther۔۱۴۸۳ء۔۱۵۴۶ء) حضرت محمدؐ کو نعوذ باللہ شیطان کی اولاد کہا کرتا تھا۔ ارنسٹ نے اس سلسلہ میں برس ہا برس تک مؤثر اور مقبول رہنے والی انگریزی کتاب ہمفری پریڈاکس (Humphery Prideaux) کی *The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mahomet*،[۱۴] کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں اس موضوع پر حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۶ء) کے ایک قدرے غیر معروف انگریزی مضمون، بعنوان *Early Christian Legends and Fables Concerning Islam* کا ذکر بے جا نہ ہو گا جو ۱۹۱۱ء میں انگلستان سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں شیرانی نے بالتفصیل رقم کیا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے ادب اور مذہبی تصانیف میں اسلام، مسلمانوں اور (حضرت) محمدؐ کے بارے میں کیسی کیسی افسانہ طرازی کی جاتی رہی ہے۔ یہ حکایات نہ صرف دروغ گوئی کی بدترین مثال ہیں بل کہ اپنے تخلیق کاروں کی ذہنی سطح اور اخلاقی حالت کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ حال ہی میں یورپی اخبارات میں شائع ہونے والے کارٹونوں اور اس امر کو جائز سمجھنے والے یورپی ذہن کو سمجھنے کے لیے ان مآخذ کا مطالعہ ضروری ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنے مضمون میں عیسائی ادب سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو پیغمبر اسلام کی کردار کشی کی مرتکب ہوئیں۔[۱۵]

۲.۳۔ صلیبی جنگیں: محرکات و اثرات:

قرونِ وسطیٰ میں عیسائی اور مسلم دنیا کے درمیان اس مخاصمت کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب صلیبی جنگیں بھی تھیں جن میں عیسائی شہزادوں نے رومن کیتھولک چرچ کی بھرپور اعانت سے ترکوں اور عربوں سے ارضِ مقدس کا قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کئی صدیوں تک جاری رہنے والی ان جنگوں میں سیاسی اور مذہبی قوتوں کا حیرت انگیز گٹھ جوڑ سامنے آیا اور اس کے نتیجے میں یہودیوں کا قتل عام اور عیسائی شہر قسطنطنیہ کا سقوط عمل میں آیا۔ ہسپانوی شہنشاہ نے پوپ کی بھرپور استعانت سے غرناطہ فتح کیا اور ہسپانیہ کی مسلمان آبادی کے انخلا یا انھیں جبری عیسائی بنانے کا حکم دیا۔ ہسپانوی تخت کی یہی مسلم دشمنی بالواسطہ طور پر امریکہ کی دریافت کا سبب بھی بنی۔ کولمبس (۱۴۵۱ء۔۱۵۰۶ء) کی مہم کو ہسپانوی شاہی تائید اس لیے حاصل ہوئی تھی کیوں کہ وہ مشرق بعید سے مصالحہ جات کی تجارت کے راستوں پر مسلم اجارہ داری سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تاہم جنوب مشرقی یورپ میں عثمانی ترکوں کی پیش رفت ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح، بلقان ریاستوں پر قبضے اور وسطی یورپ کے لیے سترھویں صدی تک ایک خطرے کی صورت جاری رہی اور سترھویں صدی کے اوائل تک انگریز مصنفین عثمانیوں کو پورے یورپ کے لیے خطرہ قرار دیتے رہے۔[۱۶]

[۴]

جدید دور میں اسلام اور مغرب میں کشمکش: اسباب و محرکات

۱.۴۔ نوآبادیاتی نظام کا ردعمل:

اگرچہ صلیبی جنگوں کے اثرات دیرپا اور دوررس تھے لیکن جدید دور میں اسلام اور مغرب کی کشمکش کی بنیاد محض صلیبی جنگوں کی یاد نہیں۔ ارنسٹ نے واضح طور پر نوآبادیاتی استعمار پسندی اور اس کے ردعمل کو اس جدید تر کشمکش کی جڑ قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں امریکی قوم نوآبادیاتی نظام کی ستم رانیوں سے پوری طرح واقف نہیں۔ فرانسیسی اور برطانوی استعمار نے انیسویں صدی میں ٹیکنالوجی میں مہارت، نسل پرستانہ نظریات اور سازشی ذہنیت کے ہتھیاروں کی مدد سے ایشیا اور افریقہ میں ظلم و استحصال کا جو بازار گرم کیا اس کی صرف ایک مثال الجیریا کی جنگ آزادی

(۱۹۵۴ء۔۱۹۶۲ء) ہے جس کے دوران دس لاکھ الجیرین باشندے اور تیس ہزار فرانسیسی مارے گئے۔ خود امریکہ کا اسلام سے اولین تعارف نوآبادیاتی دور میں افریقہ سے آنے والے حبشی غلاموں کے ذریعے ہوا جن میں سے پندرہ فی صد مغربی افریقہ کے مسلمان تھے اور جو اپنے دورِ غلامی میں نہ صرف اپنی تہذیبی روایت کے پابند رہے بل کہ ان میں سے کچھ نے تو عربی تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ امریکہ کا مسلمانوں سے دوسرا رابطہ فلپائن پر اس کے نوآبادیاتی دورِ حکومت میں ہوا جب زیادہ تر فوجی مہمات فلپائنی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو کچلنے کے لیے بھیجی جاتی تھیں (۱۸۹۹ء۔۱۹۰۲ء)۔ حال میں بھی ایران اور عراق میں امریکہ کے استعمار پسندانہ عزائم بروئے کار آتے رہے ہیں۔ غرض یہ کہ اسلام اور مغرب کی اس کشمکش کی کئی جہات نوآبادیاتی نظام کی تاریخ میں پیوست نظر آتی ہیں۔

۴.۲۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور نسل و تہذیب کی برتری کا دعویٰ:

عثمانی ترکوں کے زوال کے بعد جب یورپی اقوام نے سائنسی برتری اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ایشیا اور افریقہ کی طرف رُخ کیا تو یورپی روشن خیالی مذہب کو قدیم اور فرسودہ قرار دے کر رد کر چکی تھی۔ لہٰذا صلیبی جنگوں کی طرح مذہب کو اپنے استعماری نظام کا جواز قرار دینا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نئی صورت حال میں سائنس اور عقلیت پرستی کو فوجی مہمات کا جواز بنا کر پیش کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے نسلی برتری کی سائنسی توجیہات پیش کی گئیں۔ آگسٹس کامٹ (۱۷۹۸ء۔۱۸۵۷ء) جیسے مفکرین نے یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کی پانچ ترقی یافتہ ترین قومیں، یعنی انگریز، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور جرمن، انسانیت کا ہراول دستہ ہیں اور نسلی اعتبار سے دیگر اقوام و ملل پر فائق ہیں۔ چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء۔۱۸۸۲ء) کے نظریہ ارتقا کو استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا کہ سفید فام نسلیں دیگر نسلوں کی نسبت زیادہ ارتقا یافتہ اور اس لیے ان پر حکمرانی کی سزاوار ہیں۔ برطانیہ میں اسے ''سفید فاموں کا بوجھ'' (White Man's Burden)[۱۷] اور فرانس میں ''تہذیب کا عمل'' (Civilizing Mission) قرار دیا گیا۔ کارل مارکس (۱۸۱۸ء۔۱۸۸۳ء) اور فریڈرک اینگلز (۱۸۲۰ء۔۱۸۹۵ء) نے Oriental Mode of Production[۱۸] کے نام سے جو نظریہ پیش کیا اس کے تحت یہ بات مسلمہ حقیقت سمجھی جانے لگی کہ مشرق کے باشندوں کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ ان پر آمرانہ طرزِ حکومت مسلط رہے۔[۱۹]

نسلی برتری کے اس تصور کی شدت اور ہمہ گیری کا اندازہ معروف فرانسیسی مفکر، ارنسٹ رینان (۱۸۲۳ء۔۱۸۹۲ء) کے پیرس میں دیے جانے والے ایک لیکچر (۱۸۸۳ء) سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ اسلام سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے موزوں نہیں کیوں کہ اسلام ایک عربی مذہب ہے اور عرب، سامی النسل ہونے کے باعث اس دقت نظری اور باریک بیں ذہن سے محروم ہیں جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے لازمی ہے۔ ان دنوں معروف مسلم مصلح جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء۔۱۸۹۷ء)، بھی عارضی طور پر پیرس میں مقیم تھے۔ انھوں نے رینان کے اس دعوے کو چیلنج کر دیا اور یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر آمرانہ اور غیر سائنسی ہوتے ہیں، یہ دلیل پیش کی کہ چوں کہ اسلام عیسائیت کی نسبت ایک نوعمر مذہب ہے اس لیے اس کے تحت سائنسی اور عقلی روح کے کارفرما ہونے میں کچھ اور وقت لگے گا۔ اس تردید کے بعد رینان نے فراخ دلی سے اعتراف کیا کہ اس کا نقاد بلاشبہ فلسفیانہ تفکر کا مالک ہے لیکن اس کی وجہ یہ بتائی کہ افغانی کا تعلق سامی النسل عربوں سے نہیں بل کہ آریائی نسل سے ہے۔[۲۰] نسلی برتری کا یہ نظریہ انیسویں صدی میں عام ہی نہیں بل کہ فیشن بھی سمجھا جاتا تھا۔

عیسائی مشنری سرگرمیاں بھی نوآبادیاتی دور میں بھرپور طریقے سے کارفرما رہیں۔ مذہبی مناظرے اور منظم تبلیغی جماعتوں نے مفتوحہ علاقوں پر

گہرے اثرات مرتب کیے اور مسلمانوں کے مذہبی مناظروں میں استعمال ہونے والی زبان، اسلوب، تکنیک اور طرز استدلال پر بھی ان مشنریوں کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ تاہم نوآبادیاتی انتظامیہ کے اراکین، مذہبی اثرات سے بھی زیادہ جس محرک کے زیر اثر نظر آتے ہیں وہ یورپ کی تہذیبی اور سائنسی برتری اور عظمت کا یقین ہے۔ مثلاً لارڈ میکالے (۱۸۰۰ء ۔ ۱۸۵۹ء) کی رپورٹ *Minute on Indian Education* میں انگریزی کو برطانوی ہند کی سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دینے کے حق میں جو دلائل پیش کیے گئے وہ نوآبادیاتی طاقتوں کی ذہنیت کی خوب عکاسی کرتے ہیں[۲۱]۔ اسی طرح سر ولیم میور (Sir William Muir) (۱۸۱۹ء ۔ ۱۹۰۵ء) کی کتاب *Life of Mahomet* [۲۲] میں نہ صرف پیغمبر اسلام کو شیطانی اثرات کا حامل ظاہر کیا گیا ہے بل کہ جرمن طبیب سپرنگر (۱۸۱۳ء۔۱۸۹۳ء) کی پیروی میں آپؐ کے الہامی تجربات کو سائنسی حوالوں سے مرگی کا مرض ثابت کیا گیا ہے۔

۴.۳۔ مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں:

اسی زمانے میں، جب یورپی نوآبادیاتی نظام اپنے عروج پر تھا، یورپی جامعات میں ایشیا اور افریقہ کے بارے میں علمی و تحقیقی مطالعات کا رواج ہوا جسے بعد ازاں اورئینٹل ازم کی تحریک قرار دیا گیا اور بیسویں صدی کے مابعد نوآبادیاتی دور میں ایڈورڈ سعید (۱۹۳۵ء۔۲۰۰۳ء) جیسے مفکرین نے اس علمی تحریک کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس تنقید کے نتیجے میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی مستشرقین نوآبادیاتی استعمار کے آلۂ کار کے طور پر ان علمی مشاغل میں منہمک تھے؟ نیز انھوں نے مشرقی، خصوصاً مسلم ممالک کے بارے میں جو تاثرات پیش کیے، کیا ان کا اصل مقصد محض ان ممالک پر قبضے کا جواز پیش کرنا تھا؟ ارنسٹ کا خیال ہے کہ ایسا سمجھنا مبالغے اور مغالطے پر مبنی ہوگا۔ اس بارے میں عہد حاضر کے دیگر محققین بھی ان کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔[۲۳] ارنسٹ سمجھتے ہیں کہ اکثر مستشرقین علمی لگاؤ کے باعث ان مطالعات میں مصروف ہوئے اور انھیں اندازہ تک نہیں تھا کہ ان کے پیش کردہ نظریات و خیالات اس قسم کے سیاسی نتائج کی بنیاد ثابت ہوں گے۔

البتہ یہ ضرور ہوا کہ مستشرقین کے اس مطالعے کے نتیجے میں مشرق، بالخصوص اسلام کے بارے میں چند بندھے ٹکے نظریات رواج پا گئے جو آج تک مطالعاتِ مشرق میں رہنما اصول کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ مشرق کی مابعد الطبیعیاتی فضا کے بارے میں ہے جس کے تحت یہ فرض کیا گیا کہ مشرقی ممالک کی تہذیب و ثقافت اور زندگی کا ہر پہلو مذہب سے گہرے طور پر منسلک ہے اور اس کی تمام جہات کو محیط ہے۔ ''پراسرار مشرق'' کا یہ نقطۂ نظر یورپی رومانویت کی پیداوار تھا اور اس نے مشرق کے حقیقت پسندانہ مطالعے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کیے رکھی۔ مستشرقین کی ایک اور مشترکہ خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے نسلی برتری کے تصور کو قبول کیے رکھا اور اسی کے زیر اثر مشرقی اور ایشیائی تاریخ کو سامی اور آریائی نسل کے درمیان تصادم کی صورت میں دیکھا اور سمجھا۔ تیسری بڑی غلط فہمی مستشرقین کو یہ رہی کہ مذہب اور تہذیب و ثقافت کا زبان سے گہرا اور بنیادی تعلق ہے اور محض اس کی زبان کا علم حاصل کر کے کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے مکمل شناسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

چناں چہ مسلمانوں کے تاریخی ارتقا، عصری حقائق، بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار اور تہذیبی و ثقافتی تنوع کو نظر انداز کر کے، چند عربی متون اور ایک لغت کی مدد سے اسلام کو سمجھنے اور بیان کرنے کا عمل عروج پر پہنچ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف اٹھنے والی ہر بغاوت کو اسلامی شدت پسندی پر محمول کیا گیا اور اس سامنے دھری حقیقت کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا کہ یہ سیاسی غلامی کے خلاف فطری انسانی ردعمل تھا۔

۴.۴۔ عرب اسرائیل تنازعہ:

زمانۂ حال میں صیہونیت کی تحریک اور عرب اسرائیل تصادم نے مسلمانوں کے بارے میں دہشت گردی اور شدت پسندی کے اس روایتی تاثر کو

گہرا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ صیہونی تحریک جو ابتدا میں ایک سوشلسٹ اور سیکولر تحریک تھی، بعد ازاں یہودیت کا مذہبی تشخص حاصل کر گئی۔ صیہونیت کا بانی موسز ہیس (Moses Hess)۔ (وفات: ۱۸۷۵ء) کارل مارکس کا معتمد رفیق کار تھا۔ اس تحریک نے ابتدا میں ارض موعود کی طرف نقل مکانی کو اپنا مقصد قرار دیا۔ بعد ازاں، پہلی جنگ عظیم کے بعد، جب برطانیہ نے عثمانی سلطنت کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا تو یورپ اور روس سے بڑے پیمانے پر یہودیوں کی نقل مکانی کا عمل شروع ہوا۔ برطانوی قبضے کے دوران، یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری کی مثال فرانس کے الجیریا پر تسلط کے مماثل ہے۔ ہولوکاسٹ کے نتیجے میں، دوسری جنگِ عظیم کے بعد صیہونیت کی تحریک نے زور پکڑا اور ۱۹۴۷ء میں اسرائیلی حکومت کا قیام عمل میں آیا جو آج تک عرب اسرائیل تنازعے کی بنیاد ہے۔ امریکہ کی جانب سے اسرائیل کی سرپرستی اور پشت پناہی کی جاتی رہی ہے اور امریکیوں کی اکثریت اس معاملے میں، فلسطینی عربوں کی اکثریت کو نظر انداز کر کے یہودیوں کی فلسطین پر حکومت کو حق بجانب سمجھتی ہے۔ دوسری طرف تحریکِ آزادیٔ فلسطین (PLO) جو فلسطین پر حقِ حکمرانی حاصل کرنے کے مقصد کے تحت جدوجہد کرنے والی ایک سیکولر تنظیم تھی، مغرب کی نظر میں اسلامی شدت پسندی کی ترجمان سمجھی جاتی رہی ہے اور فلسطینیوں کے جانب سے ہونے والے حملوں کو مسلم دہشت گردی قرار دیا جاتا رہا۔ یہ خیال اس حد تک جڑ پکڑ چکا ہے کہ عرب، مسلم اور دہشت گرد تینوں لفظ ہم معنی سمجھے جاتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ تمام مسلمانوں کو بلاتفریق دہشت گرد خیال کرنے میں کوئی عقلی دلیل مانع نہیں آتی۔

۴.۵۔ مسلمان عورت کا پردہ اور اس کی معاشرتی حیثیت:

مسلمانوں کے بارے ایسے بندھے ٹکے تصورات میں ایک اور کلیشے، مسلمان عورت کا پردہ بھی ہے جسے تاریخی اعتبار سے پیغمبر اسلام کی ایک سے زیادہ شادیوں کے مسئلے کے ساتھ جوڑ کر، اسلام میں عورت کے نام نہاد استحصال اور اس کے حقوق کی پامالی کی ایک طویل داستان تراشی جا چکی ہے۔ اٹھارھویں صدی میں عربی ادب کے ایک شاہکار ''الف لیلۃ ولیلۃ'' کا فرانسیسی ترجمہ ۲۴ عربوں (یعنی مسلمانوں) کی جنسی دلچسپیوں کے بارے میں یورپ کی توجہ کا مرکز بنا اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے ''حرم'' کی ہیجان انگیز کہانیوں کو فرانسیسی مصوروں نے برہنہ یورپی طوائفوں کی مدد سے تصویر کیا۔ مسلمان عورتوں کے روایتی لباس اور معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط کے مواقع نہ ہونے کے باعث، مغربی سیاحوں کی قوت متخیلہ نے بھی خوب کرشمے دکھائے اور جدید یورپی اور امریکی عوام و خواص اس مفروضے پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ مسلمان عورت اپنے انسانی حقوق سے بالکل محروم ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے وہ مسلمان اور عیسائی عورتوں کی حالت زار کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ مغرب میں عورت کو جتنی بھی آزادی حاصل ہوئی ہے، تاریخی اعتبار سے وہ بالکل کل کی بات ہے۔ ۱۸۷۰ء تک انگریز عورتوں کو جائداد کی ملکیت کا حق حاصل نہ تھا جب کہ مسلمان عورت کو شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ حق ساتویں صدی سے حاصل رہا ہے۔ ۱۷۱۶ء میں جب لیڈی میری وارٹلی مانٹیگ [۲۵] نے برطانوی سفیر کی بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے ساتھ قسطنطنیہ کا سفر کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ عثمانی امرا کی بیگمات بڑی بڑی جاگیروں کی مالک تھیں اور اپنی جائداد کی دیکھ بھال تنہا، کسی مرد کی معاونت کے بغیر کر سکتی تھیں۔ انھیں تو یہ بھی محسوس ہوا کہ مسلمان عورتوں کے نقاب نے عورتوں کو مردوں کی چبھنے والی نگاہوں سے محفوظ کر کے ایک نوع کی آزادی کا احساس دے رکھا ہے۔

اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہب کی آڑ لے کر عورت کے حقوق کی پامالی کا سلسلہ شمالی افریقہ، مشرق قریب اور ایشیا کے کئی مسلمان معاشروں میں عام رہا ہے لیکن کیا یہ بات پورے یقین اور اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اس رویے پر پوری طرح قابو پا لیا

گیا ہے؟ یہ انتہائی منافقانہ عمل ہے کہ مسلمان معاشروں کو اس عدم مساوات پر مطعون کیا جائے جس پر ابھی تک یورپ اور امریکہ خود پوری طرح قابو نہیں پا سکے۔

[۵]

مغرب میں غیر جانب دارانہ مطالعۂ اسلام: مستقبل کی ناگزیر ضرورت

ارنسٹ نے اسلام اور مغرب کے درمیان کشمکش کی پوری تاریخ بیان کرنے کے بعد چند بہت معنی خیز سوال اٹھائے ہیں۔ انھوں نے اس بین حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ عہد حاضر میں مسلمانوں کے متعلق صرف اور صرف منفی تاثرات کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلسل نشر کیا جا رہا ہے۔ پراپیگنڈے کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ پوری کی پوری مسلم تہذیب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے پر کوئی بھی معترض نہیں ہوتا۔ حالاں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسی تہذیب جو ایک ہزار برس سے زیادہ کی مدت تک، دنیا کے تقریباً نصف حصے میں پھلتی پھولتی رہی ہو، پوری کی پوری منفی عوامل پر مبنی ہو؟ اور دوسری طرف اس کے مدمقابل تہذیب ان تمام برائیوں اور الزامات سے ہمیشہ پاک رہی ہو جو مسلمانوں کے سر ڈالے جا رہے ہیں؟ مثلاً تمام مسلمانوں پر بلکہ مذہب اسلام پر تشدد پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے تو کیا انیسویں صدی کی مغربی استعمار پسندی اور ناجائز تسلط کو عیسائیت کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے؟ اسی طرح حالیہ تاریخ میں، ۱۹۹۶ء میں راسخ العقیدہ عیسائی سربوں کے ہاتھوں ایک دن میں چھے ہزار مسلمان مردوں اور بچوں کا قتل کیا پوری عیسائی دنیا کا عمل قرار دیا جانا چاہیے؟ مسلمان معاشروں پر عورتوں کو مناسب مقام نہ دینے کا الزام ہے لیکن مغربی ٹیکنالوجی کے شاہ کار انٹرنیٹ پر موجود پورنوگرافی کی لاکھوں ویب سائٹس، اور مغرب میں ٹیلی ویژن، اخبارات اور اشتہارات کے ذریعے عورت کو ایک جنسی کھلونے کی حیثیت سے پیش کرنا کیا عورت کے احترام پر مبنی عمل ہے؟

ارنسٹ کی تجویز ہے کہ آج ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ خود کو ذرائع ابلاغ کے ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے تربیت دے کیوں کہ معلومات کی ترسیل کی بجائے، تجارتی اور دیگر مقاصد کے لیے اسے مسخ کرنا ذرائع ابلاغ کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا ہے۔ خاص طور پر اسلام کے معاملے میں منفی تاثر اجاگر کرنا ایک آسان اور مقبول حربے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔[۲۶] یورپ اور امریکہ کے عوام، اپنی رائے کی بنیاد زیادہ تر ذرائع ابلاغ کے وسائل پر ہی رکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں مسلسل ایک منفی تاثر قبول کیے جاتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کو انسان سمجھنے کا عمل شروع کیا جائے اور تاریخی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے کردار و اعمال کا تجزیہ کر کے انھیں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

اس مقصد کے لیے ارنسٹ نے اپنے مطالعۂ اسلام کی بنیاد اس مفروضے پر قائم کی ہے کہ تمام مسلمان یکساں نہیں۔ وہ دنیا کے مختلف خطوں میں آباد ہیں اور اپنے اپنے معاشی، معاشرتی اور جغرافیائی حقائق کے مطابق اپنے تہذیبی طرز عمل کو ترتیب دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسا سوچنا مسلمانوں کو انسانیت کے دائرے سے خارج کرنے کے مترادف ہے کیوں کہ انسان انفرادی اور قومی سطح پر تنوع کا وصف رکھتے ہیں۔ پھر ان کے طرز عمل کو ان کے تاریخی تناظر میں سمجھنے کی بجائے محض ایک ہی گھسے پٹے رجحان کے تابع سمجھنا بھی بہت بڑی غلطی ہے اور اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہے کہ اگر مسلمان تشدد پسند ہیں تو اس عمل کا جواب بھی تشدد ہی کے ذریعے دیا جانا چاہیے۔

اگرچہ اس معاملے میں ارنسٹ کا مشاہدہ مسلمان تہذیب کی روح تک نہیں پہنچتا۔ دراصل مسلم تہذیب مسلمان معاشروں کی باطنی روح کے مترادف ہے جب کہ اسلامی دنیا کا جغرافیائی اور ثقافتی تنوع تہذیب کی ظاہری سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کی مثال کسی جدید سکائی سکریپر کی سی

ہے جس کی بنیاد مشترک ستونوں پر قائم ہوتی ہے لیکن عمارت کی ظاہری شکل وصورت میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ایک ہی عمارت میں دفتر بھی قائم ہیں، رہائشی مکان بھی اور بازار اور دکانیں بھی۔ ہر اکائی بظاہر ایک دوسرے سے جدا مگر درحقیقت ایک ہی کل کا جزو ہے۔ اسلامی تہذیب بھی کچھ مشترک بنیادی عقائد اور مسلمات کی بنا پر تعمیر ہوتی ہے مگر دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمان اپنے اپنے جغرافیائی حقائق، موسم، آب و ہوا اور تاریخی تناظر کے مطابق جزوی تفصیلات مرتب کر لیتے ہیں اور یوں ایک روح کا اظہار مختلف پیکروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ تاہم ارنسٹ کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ دنیا بھر کی ثقافتیں ایک دوسرے پر مسلسل اثر انداز ہو رہی ہیں اور یہ بھی کہ مسلمان حکمرانوں کی سیاسی نااہلی کے باعث کم و بیش تمام مسلمانوں کی تقدیر مغربی ممالک کے ہاتھ میں ہے۔ معاشی، سیاسی اور تاریخی اختلافات اپنی اپنی جگہ انفرادی خطوں کی پالیسیوں پر یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں اور انھیں نظر انداز کر دینا خلافِ فطرت ہوگا۔

ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ اگر اہلِ مغرب کے لیے مسلمانوں کو سمجھنا ضروری ہے تو کیا مسلمانوں پر یہ لازم نہیں کہ وہ بھی دیگر تہذیبوں اور معاشروں کو سمجھیں اور انھیں کلیتاً رد کر دینے کی پالیسی پر عمل پیرا نہ ہوں۔ ارنسٹ نے اس سوال کے جواب میں یاد دلایا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں جب کم و بیش نوے فی صد مسلمان آبادی مغربی استعمار کے زیر اثر آ گئی تھی، مغرب کی عیسائی طاقتوں نے جبراً اپنی زبانیں، نظامِ تعلیم اور تہذیب ان پر نافذ کر دی تھی اور انھی میں سے ایک ایسا طبقہ تیار کر دیا تھا جو نہ صرف ان کی پالیسیوں پر عمل درآمد کے لیے آلۂ کار بنا بلکہ ان کی تہذیبی و معاشرتی روح کو بھی اچھی طرح سمجھ گیا۔ اصل مسئلہ امریکہ اور یورپ میں رہنے والے اہلِ مغرب کا ہے جن کی خود پسندی انھیں آئینہ دیکھنے کی فرصت تک نہیں دیتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی نظریات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اسلامی اصطلاحات اور نظریات کے تاریخی ارتقا کو پیشِ نظر رکھا جائے اور جدید اسلامی معاشروں کا مطالعہ کھلے ذہن اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی اقدار کے تناظر میں کیا جائے۔

حواشی

۱۔ ارنسٹ، کارل ڈبلیو، ۲۰۰۵ء (۲۰۰۳ء) *Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World*، دہلی: یدا پریس، ص xiii۔xv

۲۔ سوانح اور تصانیف کی تفصیل کے لیے: http://www.unc.edu/~cernst/

۳۔ پروفیسر اسلامی تاریخ و ادبیات، یونیورسٹی آف شکاگو اور درج ذیل کتابوں کے مصنف:

Approaching the Qur'an: the Early Revelations، ۱۹۹۶ء، نیویارک، *Early Islamic Mysticism*، ایش لینڈ ۲۰۰۷ (۱۹۹۹ء) اور *The New Crusades*، نیویارک ۲۰۰۳ء

۴۔ ارنسٹ، ص xix

۵۔ ایضاً، ص xvii

۶۔ نذر الاسلام، ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء، *Islam, 9/11 and Global Terrorism: A Study of Perceptions and Solutions*، نیو دہلی، وائیوا بکس، ص ۲۳

۷۔ لیوس، برنارڈ، ۱۹۹۳ء، *Islam and the West*، نیویارک، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ص ۳

۸۔ ارنسٹ، ص۶

۹۔ ایضاً، ص۸

۱۰۔ یورپ کا اسلام کے خلاف تعصب نوآبادیاتی تسلط سے بہت پہلے قرونِ وسطیٰ کی یادگار ہے جس کا سرا صلیبی جنگوں، بل کہ اس سے بھی پہلے تک جاتا ہے اور خود ارنسٹ نے آگے چل کر ان کا مفصل ذکر کیا ہے، تاہم ان واقعات کو بھی محض مذہبی تصادم کی بجائے سیاسی مفادات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

۱۱۔ لیوس، ص vii

۱۲۔ نوآبادیاتی دور میں مسلم علما، خصوصاً ہندوستانی مسلم علما نے اس کے برخلاف عیسائیت اور اسلام کے درمیان یگانگت پر بہت زور دیا تھا تاہم اس کے محرکات بھی مذہبی نہیں تھے۔

۱۳۔ بارھویں سے چودھویں صدی تک انتہائی مقبول رہنے والی قدیم ترین فرانسیسی رزمیہ (epic) نظم *La Chanson de Roland* جس میں معروف دیومالائی شخصیت شارل میگنے کی ہسپانوی مسلمانوں سے جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم چار ہزار سے زیادہ مصرعوں پر مبنی ہے اور اس کا قدیم ترین نسخہ آکسفورڈ میں ہے۔

۱۴۔ پہلی مرتبہ ۱۶۹۷ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

۱۵۔ (نقل کفر، کفر نہ باشد کے مصداق یہ افسوس ناک کلمات یہاں صرف اس مقصد کے تحت نقل کیے گئے ہیں کہ مغرب کی اسلام دشمنی کو اس کے تاریخی تناظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکے۔ شیرانی صاحب نے عیسائی مؤرخین کی کتابوں کے پورے پورے اقتباسات اور کئی بے سروپا کہانیاں درج کی ہیں۔ یہاں انھیں مختصراً اور قدرے نرم الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔)

راجر وینڈوور (وفات: ۱۲۳۶، تیرھویں صدی کا معروف انگریز مؤرخ اور *Flowers of History* کا مصنف) اپنی تاریخ میں پہلی بار (حضرت) محمدؐ کا تذکرہ ایک عیار جادوگر اور سراسینوں کے کاذب نبی کے طور پر کرتا ہے جس نے خود کو نبی موعود ظاہر کر کے ایک ملکہ کو بہکایا اور گناہ پر آمادہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ (حضرت) محمدؐ کو مرگی کا مریض بھی کہتا ہے اور آپؐ کی وفات کے بارے میں وہی کہانی دہراتا ہے جو عیسائی ادب میں بار بار بیان کی جاتی رہی (*Flowers of History*، جلد اول، بون، ۱۸۴۹ء، ص۷۳، بحوالہ شیرانی، ص۳۲)۔ ایک اور مؤرخ میتھیو پیرس (۱۲۰۰ء۔۱۲۵۹ء، معروف انگریزی مؤرخ، اور *Chronica Majora* کا مصنف) نہ صرف راجر کے بیان کو دہراتا ہے بلکہ (حضرت) محمدؐ کی نسل کے بارے میں ایسے ایسے لایعنی انکشافات کرتا ہے جنھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ (حضرت) محمدؐ سراسینوں کے نبی ہیں جس کی وہ عبادت کرتے ہیں اور یہ کہ ایک گم راہ راہب نے اس کے نظریات تحریر کیے تھے۔ آگے چل کر وہ ہجرت کے واقعے کو اونٹوں کی چوری پر محمول کرتا ہے جس کے نتیجے میں (حضرت) محمدؐ کو شہر سے نکال دیا گیا تھا۔ ایسے کتنے ہی بیہودہ بیانات اس کی تاریخ کا حصہ ہیں جن میں (حضرت) محمدؐ کو ایک ڈاکو اور لٹیرے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے اور آپؐ کی تعلیمات کو جلب زر اور حصولِ مال و دولت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ معروف سفر نامہ نگار سر جان مینڈیول (فرانسیسی سفر نامہ نگار جس کے سفر نامے کو فرضی خیال کیا جاتا ہے تاہم کولمبس اور مارکو پولو جیسی شخصیت نے اس سفر نامے سے گہرے اثرات قبول کیے تھے)۔ ان دونوں مؤرخین کے برعکس (حضرت) محمدؐ کو نہ تو عیار جادوگر قرار دیتا ہے اور نہ ڈاکو اور لٹیرا بلکہ اس کے بیان کے مطابق (حضرت) محمدؐ ایک دانا اور مال دار شخص تھا جو علم نجوم کا ماہر اور نبوت کا دعویدار تھا اور اس نے

کئی برس تک اپنی سرزمین پر شہزادے کی حیثیت سے حکومت کی۔اس نے (حضرت) محمدؐ کا ایک معجزہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک گرجے کا دروازہ، (حضرت) محمدؐ کی آمد کے موقع پر خود بخود بڑا ہو گیا۔ یہ وہ مصنف ہے جس کی تحریر مسلمانوں اور ان کے پیغمبر کے بارے میں سب سے زیادہ ہم دردانہ جذبات پر مبنی ہے اور اس نے مسلمانوں کی تعریف کرتے ہوئے انھیں اچھے اور وفادار لوگ قرار دیا ہے جو خدا کی طرف سے ان کے پیغمبر پر نازل کی گئی کتاب القرآن کی تعلیمات پر پوری طرح عمل کرتے ہیں۔ان چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ عیسائی دنیا میں اسلام اور (حضرت) محمدؐ کے بارے میں غلط بیانی، کدورت اور نفرت کی جڑیں تاریخ میں کتنی گہری اور دور تک جاتی ہیں۔شیرانی، حافظ محمود، ۱۹۱۱ء، *Early Christian Legends and Fables Concerning Islam*، لندن: لوزاک اینڈ کمپنی۔

۱۶۔ مصنف نے یہ بات رچرڈ نولز (Richard Knolles) کی کتاب، *The General Histories of the Turks, from the first beginning of that nation to the rising of the Othoman familie; with all the notable expeditions of the Christian princes against them,* لندن: اے سلپ، ۱۶۳۰ء کے حوالے سے بیان کی ہے

۱۷۔ رڈیارڈ کپلنگ *Rudyard Kipling* کی معروف نظم، جو ۱۸۹۹ء میں فلپائن پر امریکی حملے کے آغاز میں، ایک رسالے *McClures'* میں شائع ہوئی اور جس کی توجیہ یہ کی گئی کہ سفید فام نسلوں پر باقی کی دنیا کو تہذیب سکھانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یوں یورپی استعمار پسندی کو اخلاقی جواز دینے کی کوشش کی گئی۔

۱۸۔ کارل مارکس نے کہا تھا *"Asia fell asleep in history"* ایشیا اس وقت تک بیدار نہیں ہو سکتا جب تک کوئی بیرونی طاقت (مثلاً مغربی اقوام)، اس کی اصلاح احوال کی ذمہ داری نہیں اٹھاتی۔

۱۹۔ ارنسٹ، ص ۲۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۰۔۲۱

۲۱۔ میکالے کی رپورٹ کے یہ الفاظ، جو ارنسٹ نے بھی نقل کیے ہیں، قابلِ غور ہیں:

I have no knowledge of either Sanscrit or Arabic- but I have done what I could do to form a correct estimate of their value. I have read translations of the most celebrated Arabic and Sanscrit works. I have conversed both here and at home with men distinguished by their proficiency in the Eastern tongues. I am quite ready to take the Oriental learning at the valuation of the Orientalists themselves. I have never found one among them who could deny that a single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabia. The intrinsic superiority of the Western literature is indeed, fully admitted by those memebers of the

Committee who support the Oriental plan of education.

ارنسٹ،ص۲۲

۲۲۔ ولیم میور،۱۸۵۸ء، *The Life of Mahomet and History of Islam to the era of the Hegira*، چار جلدیں، لندن: اسمتھ ایلڈر اینڈ کمپنی۔

۲۳۔ لیوس،ص۹

۲۴۔ اس ترجمے کے فرانسیسی مترجم ژاں انطونی گالاں (Jean Antoine Galland) تھے اور یہ ۱۷۰۴ سے ۱۷۱۷ء کے درمیان شائع ہوا۔

۲۵۔ لیڈی میری ووٹلی مانٹیگ (Lady Mary Wortly Montague، ۱۶۸۹ء۔۱۷۶۲ء) برطانوی طبقۂ اشرافیہ کی نمائندہ خاتون ادیب، جن کی پہچان ان کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے ترکی میں اپنے قیام کے دوران لکھے۔ ان خطوط کی بنا پر انھیں پہلی مغربی خاتون ادیب کہا جاتا ہے جنھوں نے مسلم شرق کے بارے میں سیکولر انداز میں تبصرہ کیا۔

۲۶۔ یہ مباحث اس سے پہلے ایڈورڈ سعید اپنی کتاب *Covering Islam* (۱۹۸۱ء) میں تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔

Abstract

Islam and West are not two similar terms and a comparison between the two does not seem reasonable. However, in the past history, the medieval term of Christendom was replaced by the term "West" after the secularization of Europe which gradually included America as well; while Islam has been considered a synonym of Muslim world and most of all Arabs. The image of "Islam" in West has been negative right from the medieval ages till today. The colonization of almost 90% of the Muslim countries in the nineteenth century played a significant role in creating awareness among Muslims of the oppression of their political and human rights and thus causing a widening gulf between the two. Carl W. Ernst in his book Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World has discussed in detail the conflict between Islam and west in the historical as well as contemporary context. He has suggested rethinking Islam in the cotemporary world after forgetting the pre-conceived notions and images given by the authors of the Crusades period or the Orientalists of the period of colonization. The article gives a review of a part of the book.